# حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''نبی رحمتؐ'' پر ایک نظر!

☆پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد

برصغیر پاک و ہند کے مایہ ناز عالم کثیر التصنیف بزرگ، دنیائے عرب کی مقبول شخصیت صاحب طرز انشا پرداز، نمونۂ سلف، نیک سیرت پاک، نہاد اور یادگارِ زمانہ حضرت مولانا ابوالحسن علی الندوی یعنی مولانا علی میاںؒ کی اردو کتاب نبی رحمتؐ (جلد اول و دوم مجلس نشریات اسلام، کراچی، باردوم ۱۹۸۱ء/۱۴۰۱ھ) ایک قابل قدر تصنیف اور سیرت نبویؐ کے اردو لٹریچر میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

یہ کتاب خود مولانا علی میاں کی تصریح کے مطابق اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن اسے اردو کے قالب میں مولانا موصوف کے بھتیجے، مرحوم سید محمد الحسنی نے ڈھالا (دیکھیے، دیباچہ طبع دوم ۳) اردو ترجمہ، ترجمہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا اور زیر نظر دوسرا ایڈیشن تو خود مولانا موصوف کی حرف بہ حرف اصلاح و نظر ثانی کے بعد گویا اصل متن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں عموماً اور اردو زبان میں خصوصاً سیرت مطہرہ پر کتابوں کی کثرت ناقابل شمار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے تقریباً ہر پہلو، اور ہر موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کسی فرد یا ادارہ کے لیے اس کا احاطہ ناممکن ہے۔ مزید براں نوعیت کتاب و مواد کے اعتبار سے ہر معیار اور ہر انداز کی کتابیں پائی جاتی ہیں، مثلاً ایسی کتابیں بھی ہیں جو خالص علمی، تکنیکی اور تحقیقی نوعیت رکھتی ہیں اور زبان و بیان اتنا معیاری، مشکل اور خشک کہ عام قاری کے لیے انکا سمجھنا اور اُن سے استفادہ تقریباً ناممکن ہے۔ دوسری ایسی عامیانہ طرز کی کتابوں کی بھی کمی نہ تھی جن کا اصل مطمح نظر، عوام الناس کی خوشی اور دلچسپی ہوتی ہے، چاہے اس کی خاطر مصنف کو ادنیٰ و اعلیٰ کسی معیار کا مآخذ استعمال کر کے قصہ کہانیوں اور بے اصل روایات کا ہی سہارا کیوں نہ لینا

پڑے اور قرآن وحدیث کے بیان ومفہوم سے کتنا ہی انحراف اور بعد کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ ظاہر ا یہ دو انتہائیں ہیں جبکہ توازن و تناسب ان دونوں کے مابین ہی تلاش کیا جا سکتا ہے اور توازن و تناسب ہی دراصل حسن کی ضمانت بن سکتا ہے، چونکہ زیر نظر کتاب میں بھی توازن و تناسب کی جلوہ آرائی ہے، اس لیے یہاں بھی حسن بیان، حسن ترتیب اور حسن انتخاب ہے'' (پیش لفظ ص ۱۲) کیونکہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سب سے زیادہ مکمل بھی ہے اور حسین بھی'' (ایضاً ص ۱۹)

مولانا علی میاں کی اس کتاب میں انتہا پسندی نہیں، بلکہ یہ درد وسوز اور آرزومندی کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اگرچہ ''بقلم خود'' پہلے بھی بہت کچھ لکھا تھا، تاہم بقول ان کے خاص سیرت کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی۔ (پیش لفظ ہذا)، چنانچہ انہوں نے اپنی سعادت سمجھ کر یہ کوشش کی کہ وہ بھی سیرت نبویؐ پر ایک نئی کتاب لکھ کر اس محبوب وجلیل القدر موضوع کے مصنفین کی نورانی فہرست میں شامل ہو جائیں (دیکھیے ایضاً ص ۱۶) اس طرح یہ بالکل واضح ہے کہ یہ کتاب دراصل ان کی بہترین تمناؤں کا ماحصل ہے۔

اصل کتاب سے پہلے خود مصنف علام کے قلم سے جو طویل پیش لفظ (کتاب کے ۲۴ صفحات پر مشتمل) شامل ہے، اس میں وجہ تالیف کے ضمن میں جو تفصیل دی گئی ہے اس سے نہ صرف یہ کہ مولانا علی میاں کے اسلوب سیرت نگاری پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ خود اس کتاب کی نوعیت واہمیت اور خصوصیت کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کا خلاصہ ہم کم وبیش اُن ہی کے الفاظ میں نقل کر رہے ہیں:

۱۔ ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت تھی جو ایک طرف عصری اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو (پیش لفظ، ص ۱۰) اور

۲۔ اس میں قدیم وجدید دونوں قسم کے مآخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو (ایضاً)

۳۔ سیرت کے اولین اور اصل (original) مآخذ پر اس کی بنیاد ہو اور قرآن و حدیث سے سرمو انحراف نہ ہو (ایضاً ص ۱۱)

۴۔ جو موسوعی (Encyclopaedic) طرز پر نہ لکھی گئی ہو، جس میں سارے معلومات بغیر کسی نقد وتمحیص کے بھر دیئے جاتے ہیں اور ہر طرح کا ضروری وغیر ضروری مواد پیش

کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے (ایضاً)

۵۔ جسے ہر مصنف مزاج، تعلیم یافتہ شخص (خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کے سامنے کسی تحفظ استثناء اور کسی تاویل کا سہارا لیے بغیر پیش کیا جا سکے (ایضاً)

۶۔ جس میں صداقتوں اور زندہ حقیقتوں کو فلسفۂ کا رنگ دینے، واقعات کی تاویل کرنے اور اس کے لیے طویل و عریض مضمون باندھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی ہو (ایضاً)

۷۔ اس میں عقل و جذبات کی بیک وقت جلوہ گری اور کارفرمائی ہو"۔ (ص ۱۲)

اس کی توجیہہ موصوف خود فرماتے ہیں: "ایسا نہ ہو کہ عالمانہ بحث اور معروضی نقد و جائزہ، جذبۂ محبت اور ذوق و شوق کی کیفیت کو سرد و افسردہ کر دے، جو سیرت کے جمال جہاں آراء سے لطف اندوز ہونے اور اپنے دیدۂ و دل کو اس سے روشن اور منور کرنے کی ایک ناگزیر ضرورت اور اس سے صحیح و کامل استفادہ اور اس کے مسائل احکام اور واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی لازمی شرط ہے۔ (ایضاً)

۸۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ جذباتی و ایمانی عنصر عقل سلیم کے تقاضوں پر غالب نہ آجائے جن کی اہمیت عصر حاضر نے خاص طور پر بڑھا دی ہے۔ (ایضاً)

۹۔ نہ وہ منطق کے صحیح معقول اور قابل فہم اصولوں کے منافی ہو۔ (ایضاً)

۱۰۔ نہ عقیدہ اور تقلید پر مبنی ایسا خراج عقیدت اور خراج تحسین ہو جس کو صرف قوی الایمان پشتینی مسلمان اور وہ علماء راسخین قبول و تسلیم کر سکیں جن کی بیرونی دنیا اور جدید ثقافت سے کوئی رسم و راہ نہیں" (ایضاً)، چونکہ اسوۂ نبویؐ کے اتباع اور پیروی کا جذبہ پڑھنے والے میں خود بخود پیدا ہوتا ہے" (ص ۲۲) لہٰذا ان کے خیال میں سوانح کو:

۱۱۔ کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین و آرائش کے بغیر قاری کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ جمال فطرت اور حسن حقیقت کو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے (ایضاً)۔

۱۲۔ نقشوں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ ان سے بہت سی ایسی حقیقتیں آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہیں جو بعض اوقات طویل عبارتوں سے بھی سمجھ میں نہیں آتیں"۔ (پیش لفظ ص ۲۳)، اگرچہ نقشے بہت کم ہیں۔ حصہ اول میں ۳ نقشے اور ۲ دھندلی تصویریں، حصہ دوم میں کل دو

نقشے ،نقشوں کی تعداد ناکافی ہے اور موجودہ نقشوں اور تصویروں پر نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اگرچہ یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ نبی رحمتؐ کی تصنیف و تالیف میں مصنف نے کن باتوں کی رعایت رکھی ہے۔تاہم اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت اس کی مقصدیت سے وابستہ ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی تصنیف سیرت میں الگ الگ یا مجموعی طور پر درج بالا التزامات کا اہتمام کیا گیا ہو، جس کے سبب اس کی علمی قدر و قیمت دو چند ہوسکتی ہے، لیکن مقصدیت سے خالی کتاب خلق خدا کے لیے نافع نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً غیر مسلموں کے لیے جن کا سیرت پر حق اُن مسلمانوں سے ہرگز کم نہیں جو پہلے ہی سے اسلام و ایمان کے سایۂ رحمت میں ہیں (دیکھیے پیش لفظ ص ۱۳) مولانا علی میاں اس مقصدیت کو نمایاں کرتے ہوے رقمطراز ہیں: ''یہ کوشش کی گئی ہے کہ کتاب علمی اور تربیتی و دعوتی دونوں پہلوؤں کی جامع ہو اور انہیں سے کوئی ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب نہ آجائے'' (ملاحظہ ہو ص ۲۱)۔ اسی مقصدیت کا تطابق پیش لفظ کے آخری جملوں سے بھی ہورہا ہے کہ ''اگر یہ کتاب کسی صاحب ایمان کے دل میں شوق و محبت کی ایک چنگاری بھی بھڑکا دیتی ہے اور کسی غیر مسلم کے دل میں اس کو پڑھ کر اُس نبی رحمتؐ کی سیرت مطہرہ کی طرف کوئی کشش، آپؐ کی محبت کی کوئی لہر اور اسلام کے سمجھنے کا جذبہ بیدار کردیتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدا کے یہاں قبول اور مصنف کے لیے ذریعہ مغفرت اور وسیلۂ شفاعت ہوتو وہ سمجھیے گا کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی'' (ایضاً ص ۲۳، ۶۴)

۹ مقصدیت کا یہ پھیلاؤ اور رچاؤ ایک طرف تو اس لیے قابل فہم ہے کہ وہ خود سید احمد شہیدؒ والے حسنی سادات کے جس خاندانی ماحول کے پروردہ اور جس تہذیبی و ثقافتی فضا سے آسودہ اور جس تبلیغی تحریک سے وابستہ تھے، اس کا منطقی تقاضہ یہی تھا اور دوسری طرف یہ مقصدیت بجائے خود اتنی اہم ہے کہ اگر متذکرۃ الصدر لوازم سیرت نگاری میں تھوڑی بہت کسر بھی رہ جائے تو گوارہ کرلیا جانا چاہیے۔ شاید اسی لیے انہوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ ''قدیم اور جدید لٹریچر میں جو بھی کام کی چیز مجھے ملی میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی'' (پیش لفظ ص ۲۱)

(۲) نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ضخیم کتاب ہے جو (۵۸۸ صفحات پر مشتمل اور) دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ۲۹۴ صفحات اور ۳۰ صفحات کا اشاریہ اس کے علاوہ ہے، جبکہ

دوسرا حصہ ۲۳۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور ۳۲ صفحات پر مبنی اشاریہ (Index) الگ سے ملحق ہے۔

حصہ اوّل کو بطور تعارف سات (۷) بڑے موضوعات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تمہیدی مضمون اور موضوع پس منظر قرار دیا جا سکتا ہے جو (ص ۲۵ تا ۴۵ صفحات پر محیط ہے) چھٹی صدی عیسوی میں تمام دنیا کے ملکوں اور قوموں کا عمومی جائزہ پیش کرتا ہے اور مشرقی رومی سلطنت، ایرانی شہنشاہی، ہندوستان اور جزیرۂ العرب کے علاوہ یورپ میں گھٹا ٹوپ اندھیرے اور جان لیوا مایوسی کا منظر پیش کر کے عالمگیر فساد کے نتیجہ تک قاری کو پہنچا دیتا ہے، تاکہ وہ اگلے موضوع کی اس معنویت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکے کہ ایک مستقل نبی کی ضرورت عالمگیر سطح پر پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ضرورت ایسی شدید، یہ تڑپ ایسی جاں ستاں اور طلب ایسی بروقت تھی کہ نبی آخرالزماں، نجات دہندۂ انسانیت بن کر ناف زمین، یعنی مکۃ المکرّمہ میں تشریف لائے کہ اگر وہ نہ آتے تو انسانیت کی تباہی و بربادی مقدر ہو جاتی، اس پس منظر کی اہمیت اور توجیہہ مصنف خود فرماتے ہیں:

> ''مصنف سیرت نگاری کے وقت اس ماحول اور اس عہد کو بھی کسی طرح نظر انداز اور فراموش نہیں کر سکتا جس میں نبوت محمدی کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا، اس لیے اس عہد کی عالمگیر جاہلیت کی پوری تصویر کشی بھی ضروری ہے جو چھٹی صدی مسیحی میں ہمیں ساری دنیا پر محیط نظر آتی ہے، اس میں یہ بھی دکھانا ہوگا کہ اس زمانہ میں فساد اخلاقی بگاڑ اور انسان کی بے چینی و اضطراب کس درجہ پر پہنچ چکا تھا، اس کی اخلاقی سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کیا تھی؟ تخریب و فساد کے کیا کیا اسباب و عوامل اس وقت کی دنیا میں کارفرما تھے اور کیسی کیسی ظالمانہ حکومتیں، مسخ شدہ مذاہب، انتہا پسندانہ و خیالی فلسفے تباہ کن تحریکیں اور دعوتیں اپنا کام کر رہی تھیں (ملاحظہ ہو پیش لفظ ص ۱۳)

(۲) دوسرا موضوع ایک تو اس پہلو پر روشنی ڈالتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وقت کی ضرورت اور زمانہ کی آواز بن کر تشریف لائے تو جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے اور عرب میں بھی آپ کا ظہور مکہ مکرمہ میں کیوں ہوا۔ اس ضمن میں عرب کا تاریک ترین دور اور ایک مستقل نبی کی ضرورت، جزیرۃ العرب، اس کے حدود، طبعی حالات، تمدنی و ثقافتی مراکز، طبقات معاشرہ، انسانی

وحدت، اقوام وملل کی تاریخ میں عرب کا تعلق، بعثت نبوی سے پہلے کا حال احوال وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے اور وضاحت کے لیے جزیرہ نمائے عرب کا ایک نقشہ طبعی حالت کو واضح کرنے کے لیے ص ٦٦ کے بالمقابل دیا گیا ہے اور ایک نقشہ میں (ص ۷۰ کے بالمقابل) اہم قبائل کے مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۳) تیسرا اہم موضوع مکہ معظمہ ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہوئی، مکہ مکرمہ کا تعارف، اس کی عظمت و اہمیت، بعثت نبوی کے وقت اس شہر، البلد الامین کی حیثیت، وہاں کی معاشرتی زندگی اور تجارتی و اقتصادی صورت حال، مکہ کی صنعتیں، جنگی طاقت، عرب میں اس کی روحانی و سماجی پایۂ تخت کی حیثیت، اخلاقی و مذہبی پہلو وغیرہ کی تفصیلات ص ۸۸ سے ص ۱۰۱ تک پائی جاتی ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت مصنف علام کی زبان میں یہ ہے کہ ''یہی اس ماحول اور اس شہر کا نقشہ تھا جہاں اسلام کی پہلی کرن چمکی، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور دعوت حق کے قافلہ نے پہلا قدم آگے بڑھایا، جہاں آپ کی عمر مبارک کے ۵۳ سال گزرے اور جہاں تیرہ سال دعوت اسلام کے سخت و جاں گداز مرحلوں میں بسر ہوئے۔ سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عقل وشعور اور تہذیب وتمدن کی جو سطح تھی اس سے باخبر ہو نیز اس ملک کے اجتماعی اور سیاسی اور دینی و مذہبی حالات اس کے اقتصادی و سیاسی ڈھانچہ اور حربی اور عسکری طاقت کی نوعیت سے بھی واقف ہو، تاکہ اس ملک کے باشندوں کے رجحانات، اُن کے مزاج و افتادِ طبع، ان کے ذہن ونفسیات کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پورا اندازہ ہو سکے جو اسلام کی ترقی و پیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں''۔ (ملاحظہ ہو، پیش لفظ ص ۱۴)

(۴) چوتھا موضوع ولادت باسعادت سے آغاز نبوت تک (ص ۱۰۲ تا ۱۱۴) پچھلے موضوعات سے بھی مربوط اور سلسلہ وار ہو جاتا ہے اور پھر اگلے مرحلہ میں بعثت مطہرہ کے بعد سے ہجرت مدینہ تک، پانچویں موضوع کی وسعتیں آکر مل جاتی ہیں۔ انسانیت کی صبح صادق (۱۱۵)، کوہ صفا پر پہلا اعلان حق (ص ۱۲۰) جس میں خطبہ کوہ صفا کے اصل اور مرکزی الفاظ (فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید) کا خوشگوار اندراج بھی ہے (جسے اکثر وبیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے)

(ص ۱۲۲) پھر اسلام دشمنی و ایذا رسانی کا آغاز اور جناب ابو طالب کی مدافعت و شفقت، جس میں قریش کی طرف سے مظالم کا سلسلہ، مسلمانوں کی ہجرت حبشہ (ص ۱۳۳) ''قریش کی طرف سے مزید ظالمانہ کارروائیاں یہاں تک کہ ان کی طرف سے بنو ہاشم کا مقاطعہ بھی کیا گیا، جس کا ذیلی عنوان (ص ۱۴۰) پر یہ دیا گیا: قریشی کی طرف سے بنی ہاشم کا مقاطعہ اور محاصرہ''۔

یہاں یہ امر راقم الحروف کے لیے سخت تعجب کا باعث ہے کہ مولانا علی میاں جیسے باخبر عالم، شعب ابی طالب کے حوالے سے عام سیرت نگاروں کے سرسری روایتی بیانات کی چھان پھٹک نہ کر سکے اور حرمین کی بار بار کی زیارتوں اور مکہ معظمہ کے چپہ چپہ سے واقف ہونے کے باوجود شعب ابی طالب کا محل وقوع اور دستاویز مقاطعہ کے تقاضے ان کی نگاہ دور رس سے کیسے اوجھل رہ گئے۔ حالانکہ قریش نے جس دستاویز کی بنا پر معاشی و معاشرتی مقاطعہ کو لاگو ٹھہرایا، اس کے الفاظ (**لاینا کحوھم و لا یبا یعوھم حتی یسلموا الیھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم**) میں نہ ''محاصرہ'' داخل تھا، نہ بنو ہاشم کے اپنے محلّہ ''شعب ابی طالب'' سے بے دخلی یا نقل مکانی یا شہر بدری (شعب ابی طالب اور اس کے متعلقات پر مفصل بحث کے لیے راقم الحروف کا مقالہ ملاحظہ ہو: ''شعب ابی طالب'' نقوش رسول نمبر لاہور ۱۹۸۴ء ج ۹ ص ۲۶۰ تا ۲۶۸)۔

واقعات سیرت کے بیان میں مقصدیت کی جلوہ نمائی قدم بہ قدم جلوہ فگن ہے، چنانچہ قرآن مجید کی انقلاب آفرینی و مسیحائی اور قلب سلیم پر اس کے اثرات کا اندازہ طفیل دوسی کی سرگزشت سے ہوتا ہے (دیکھیے ص ۱۴۲، ۱۴۳)، پھر طائف کے سفر میں دعائے مضطر کا اندراج (ص ۱۴۶)، معراج کے بلند و لطیف مطالب و معانی کا اظہار بقول مصنف واقعہ معراج دراصل ایک محدود مقامی عارضی نوعیت اور نبوت کی ابدی اور عالمگیر شخصیت کے درمیان خط فاصل اور درمیانی لکیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ گویا اہل نظر کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں قبائل عرب کو دعوت اسلام، اسلام ابی ذر (ص ۱۵۰) انصار کے قبول اسلام کا آغاز اور اس کے نتیجہ میں بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ (ص ۱۵۲ تا ص ۱۶۰)، نیز انصار کے قبول اسلام کے اسباب (۱۵۳ تا ۱۵۶)، یثرب کی خصوصیات (ص ۵۷۔۱۵۶)، مدینہ میں اسلام کا فروغ (ص ۱۵۹) اور خاص طور پر بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد مدینہ ہجرت کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس دوران حضرت ابو سلمہؓ اور صہیب رومی کے رقت آمیز

واقعات (ص ۶۳۔۱۶۱) یہاں تک کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے لیے بھی اسباب و علل مجتمع ہوتے چلے گئے جس میں آپ کی شمع حیات گل کرنے کے لیے قریش کی سازش و ناکامی کا بھی دخل تھا۔ سفر ہجرت میں تاثراتی انداز برقرار رکھنے کے لیے (علمی وتحقیقی مباحث کو چھیڑے بغیر) مولانا علی میاں ایسی روایتوں کو بھی جلی سرخیوں کے ساتھ لے آئے ہیں (مثلاً آسمانی کمک اور غیبی امداد ص ۱۶۸ یا ام معبد کا مبارک شخص کے تحت واقعہ ص ۱۷۱) جن کے بارے میں اہل تحقیق احتیاط برتتے ہیں۔ مولانا شبلی بھی نہیں مانتے اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی (ج ۳ ص ۶۵۸ تا ۶۶۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء) میں ان کے بارے میں تفصیلی تنقید کی ہے۔ قبا میں آپ کا ورود مسعود ۱۲ ربیع الاول بتایا گیا ہے (ص ۱۷۱) جبکہ یہ ۸ ربیع الاول کا واقعہ ہے۔

(۶) چھٹا بڑا موضوع ہجرت مدینہ کے بعد سے ۵ ھ کے واقعات پر مشتمل ہے اور بعض مباحث کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ عہد بعثت کے یثرب (مدینہ) پر ایک نظر اور یثرب کا پیچیدہ اور ترقی یافتہ معاشرہ (ص ۱۷۲ تا ص ۱۹۱) کافی تفصیل سے تعارف، مذہبی امور، دینی وثقافتی حالت عناصر آبادی، طبعی وجغرافیائی کیفیت، دینی و معاشرتی حیثیت، اقتصادی وتمدنی حالت وغیرہ سب شامل ہے۔ مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد وہاں پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے کے لیے تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اقدامات فرمائے مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ مسجد نبوی اور مکانات کی تعمیر، مواخاۃ وغیرہ۔ ایک عنوان حضورؐ کی تحریر اور یہود سے امن و امان کا معاہدہ (ص ۱۹۸)، محض چار سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مدنی زندگی کا یہ اہم ترین واقعہ حضرت مولانا علی میں نے انتہائی سرسری انداز سے لیا ہے اور کسی قدر حقائق سے بھی دور ہے۔ بعض سیرت نگار اسے اگرچہ میثاق مدینہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، لیکن نہ تو وہ یہود سے معاہدہ تھا نہ میثاق، وہ دراصل ایک منشور اور ایک فرمان تھا جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آمر وحاکم وسربراہ مملکت مدینہ کی حیثیت سے جاری فرمایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اسی کو ''دنیا کا پہلا تحریری دستور'' قرار دیتے ہیں (اس پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ راقم کا مقالہ عہد نبوی میں ریاست کا نشو وارتقاء، نقوش لاہور ۱۹۸۳ء رسول نمبر جلد ۵ ص ۹۰ تا ۱۱۱)۔ مدینہ میں نفاق اور منافقین کا ظہور (ص ۱۹۹)۔ یہود کی دشمنی کا آغاز (ص ۲۰۲) اور ان سے تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک یہودی فاضل اسرائیل ولفنسن کا مفید اقتباس

اور یہود کے جولوگ مسلمان ہوئے اور ان کو شرف صحبت حاصل ہوا ان کی تعداد ۳۹ تک پہنچتی ہے۔ یہ اور دوسری متعلقہ معلومات ایمان افروز ہیں (ص ۱۰۴، ۱۰۵)

مدینہ کے مسلمانوں سے قریش کی چھیڑ چھاڑ (ص ۲۰۷) کے بعد قریش مکہ سے تعلقات کا مفصل جائزہ بشمول غزوات (بدر، احد، خندق) کے ساتھ ساتھ بعض اہم نکات کا بیان ہے، (مثلاً غزوہ بدر میں مسلمانوں اور کافروں کی جنگی طاقت کا زبردست فرق (ص ۲۱۶) مشورہ کی اہمیت (ص ۲۱۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سپہ سالار (ص ۲۱۸) امت کا صحیح تعارف اور اس کے اصل مقام و پیغام کا تعین (ص ۲۲)، دوران جنگ موثر واقعات، غزوۂ احد میں محبت اور جانثاری کی نئی نظیریں (ص ۲۳۴) ایک مومنہ کا صبر (ص ۲۳۹)، صحابیات کی جانثاری (ص ۲۴۱) واقعہ رجیع اور بئر معونہ (ص ۲۴۴) بنی النضیر کی جلاوطنی (ص ۲۴۵)، غزوۂ خندق (ص ۲۴۹) آپؐ کے بعض معجزات (ص ۲۵۳)، غیبی نصرت (ص ۲۵۸) غزوۂ خندق کے فوراً بعد غزوۂ بنی قریظہ (ص ۲۶۲) غزوۂ بنی المصطلق اور واقعہ افک (۲۷۲) وغیرہ۔

(۷) ساتواں موضوع صلح حدیبیہ (ص ۲۸۰ سے ۲۹۳ تک پھیلا ہوا ہے)۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ پیشگوئی فرما چکے تھے کہ ''اس سال کے بعد اب قریش تم پر چڑھ کر نہیں آئیں گے، بلکہ تم ہی ان پر حملہ آور ہوگے'' (ص ۲۶۱)۔ اس سے ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد سے واقعات و حالات اور تاریخ سیرت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لیے نبی رحمت کی جلد اول کا یہ آخری موضوع دوسری جلد کے پہلے باب ''سلاطین و امراء کو دعوت اسلام'' سے مربوط و متعلق ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ صلح حدیبیہ کا محل وقوع اور بعض دوسرے پہلو بہت تشنہ ہیں۔

نبی رحمت حصہ دوم کا اختتام اگرچہ (ص ۲۱۰ پر) ہو جاتا ہے، لیکن اس سے ملحق جلسۂ سیرت کی ایک تقریر کا مفصل اقتباس مضمون کی صورت میں (ص ۲۱۱ تا ۲۳۲) دراصل پوری کتاب کا خلاصہ اور مطالعہ سیرت کا ماحصل ہے اور احسانات رحمۃ العالمین کا جامع، اور کتاب کی مقصدیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ بارہ اہم موضوعات پر مشتمل ہے، یعنی سلاطین و امراء کو دعوت اسلام (ص ۹ تا ۳۴)، غزوۂ خیبر (ص ۳۵ تا ص ۴۸)، غزوۂ موتہ (۴۹ تا ۵۵)، فتح مکہ (۵۷ تا ص ۸۰)،

غزوہ طائف (ص ۸۸ تا ص ۹۸)، غزوۂ تبوک (ص ۹۹ تا ص ۱۱۸)، وفود کا سال (ص ۱۱۹ تا ۱۲۷)، حجۃ الوداع (ص ۱۲۸ تا ۱۴۲)، وفات (ص ۱۴۳ تا ۱۶۲)، ازواج مطہرات و اولاد اطہار (ص ۱۶۳ تا ۱۷۳) اور اخلاق و شمائل (ص ۱۷۴ تا ۲۰۱)۔ اشاریہ (انڈکس) آخر میں دیا گیا ہے۔

صلح حدیبیہ سے جس نئے دور کا آغاز ہوا اور دعوت اسلامی و ترقی و پیش قدمی کا موقع ملا، اس کا سب سے اہم واقعہ سلاطین و امرء کو دعوت اسلام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین عالم اور امرائے عرب کو متعدد خطوط لکھے اور ان کو بڑے حکیمانہ انداز میں اسلام کی دعوت دی (ص ۹) حاشیہ کے مطابق قابل ترجیح قول یہ ہے کہ یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد ماہ ذی الحجہ ۶ھ میں بھیجے گئے، جیسا کہ واقدی کی رائے ہے یہ ۶۲۷ء کے مطابق ہے، اس لیے کہ ان سلاطین میں سرفہرست ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز تھا جو مارچ ۶۲۸ء میں مارا گیا (ص ۹)، دعوتی خطوط رومی شہنشاہ ہرقل، ایرانی شہنشاہ کسریٰ پرویز، حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور مصر کے بادشاہ مقوقس کے نام بھیجے گئے (ص ۱۰) اس سلسلہ میں کتاب میں مکاتیب نبوی کا متن، ترجمہ، سلاطین کا تعارف، ان کا زمانہ اور ضروری حالات کے علاوہ یہ بھی مذکور ہے کہ ان سلاطین نے نامہ ہائے مبارک کے ساتھ کیا معاملہ کیا (ص ۲۳)، تفصیلات میں بعض مفید بحثیں بھی آ گئی ہیں، مثلاً اریس کون تھے؟ (ص ۲۸) جن امرائے عرب کے نام مکاتیب نبوی روانہ کیے گئے (ص ۳۳)، ان میں حاکم بحرین، امرائے عمان اور حاکم یمامہ شامل ہیں ان کا ردعمل بھی مذکور ہے (ص ۳۴)

صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان کے شرکاء کو جس فتح قریب اور مال کثیر کی (سورۃ فتح ۱۸، ۱۹) بشارت سنائی گئی تھی، ان فتوحات کا مقدمہ اور پیش خیمہ غزوۂ خیبر تھا (ص ۳۵)، غزوہ خیبر اور اس کے متعلقات کا بیان رسمی و روایتی ہے (ص ۳۵ تا ۳۸)، یہی صورت سریۂ موتہ کی ہے (جسے مصنف نے غزوۂ موتہ کا عنوان دیا ہے ص ۴۹)، فتح مکہ تو براہ راست صلح حدیبیہ کا نتیجہ تھا۔ بیان میں دیگر تفصیلات کے علاوہ خطبۂ مکہ (ص ۷۱)، نبی رحمت کی حیثیت سے اپنے دشمنوں کے ساتھ آپ کا حسن سلوک (ص ۷۳)، جاہلیت کے آثار اور بت پرستی کے نشانات کا خاتمہ (ص ۷۷) اور فتح مکہ کے اثرات (ص ۷۸) شامل ہیں۔ پھر غزوۂ حنین (ص ۸۱ تا ۸۷)، غزوۂ طائف (ص ۸۸، ۹۰)، تقسیم غنائم (ص ۹۰)، عمرۂ جعرانہ (۹۵) اور کعب بن زہیر کا قبول اسلام (ص

۹۶۔۹۸) بیان کیا گیا ہے۔

غزوۂ تبوک حیات طیبہ کا آخری غزوہ ہے جو ایک خاص نفسیاتی اثر اور اسباب (ص ۹۹) کے تحت رجب ۹ ھ میں پیش آیا (ص ۱۰۳)، مصنف علام اس غزوہ کے مقصد اور اہمیت کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ رقمطراز ہیں کہ:

''کہا جا سکتا ہے کہ اس غزوۂ کا اصل مقصد پڑوسی حکومت کو خوفزدہ کرنا تھا جس سے مرکز اسلام اور اسلام کی بڑھتی ہوئی اور ابھرتی ہوئی دعوت اور اس کی روز افزوں قوت و طاقت کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس غزوہ کے ذریعہ اُس حکومت کو یہ آگاہی دینی تھی کہ مسلمانوں پر ان کی سرزمین کے اندر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے''۔ (ص ۲۔۱۰۱)

آگے لکھتے ہیں: ''یہ مقصد اس غزوہ سے پورا ہوگیا، رومیوں نے اس کا جواب کسی جوابی حملہ اور پیش قدمی، فوجی نقل و حرکت اور سرگرمی سے نہیں دیا، بلکہ انہوں نے اس کھلے ہوئے چیلنج کے مقابلہ میں ایک طرح کی پسپائی اور خاموشی اختیار کر لی اور اس نو زائیدہ طاقت کا جتنا اندازہ انہیں اس وقت ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا'' (ص ۱۰۲)

اس غزوہ کا دوسرا فائدہ ان کے نزدیک یہ تھا کہ ''جزیرۃ العرب کے ان قبائل نیز ان فاتح اور با اقتدار قبائل (جو رومی شہنشاہ سے متعلق اور اس کے ماتحت تھے) کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب و داب قائم ہوگیا اور اس کے ذریعے ان کو یہ موقع ملا کہ وہ دین اسلام کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں'' (ص ۱۰۲)، پھر آگے لکھا ہے: ''مختصر یہ کہ اس غزوۂ کی سیرت نبوی اور دعوت اسلامی کی تاریخ میں خصوصی اہمیت ہے اور اس سے ان مقاصد کی تکمیل ہوئی جو مسلمانوں اور عربوں کے حق میں بہت دوررس تھے اور جن کا تاریخ اسلام کے تسلسل اور آئندہ پیش آنے والے واقعات پر گہرا اثر پڑا'' (ص ۱۰۳)۔ مصنف علام نے اس غزوہ میں بھی ''جہاد اور روانگی لشکر میں صحابہ کا ذوق و شوق او رجذبۂ مسابقت (ص ۱۰۵)، ایک غریب مسلمان (حضرت عبداللہ ذوالبجادینؓ) کے جنازہ میں سرور کائناتؐ کی شرکت اور اپنے مقدس ہاتھوں سے تدفین کا شرف عطا کرنا (ص ۱۰۸۔۱۰۹)، حضرت کعب بن مالک کا ابتلاء اور ان کی کامیابی و سرخروئی (ص ۱۰۹۔۱۱۵) جیسے واقعات کو اجاگر کیا

ہے، مگر تعجب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے انفاق کا تذکرہ تک نہیں کیا، صرف حضرت عثمانؓ کے ایک ہزار دینار سے جیش العسرۃ العرہ کی مدد کا محض ایک ڈیڑھ جملے میں سرسری سا ذکر کیا ہے (دیکھیے ص ۱۰۵)، غزوات پر ایک نظر (ص ۱۱۵) مختصر مگر مفید جائزہ ہے۔ غزوات کی کل تعداد ۲۷ اور سرایا کی ۶۰ ہے۔ ''غزوات قرآن مجید کے دو حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہیں ایک الفتنہ اشد من القتل (فتنہ انگیزی قتل سے بڑھ کر ہے) دوسرے ''ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب (اے عقل والو تمہارے لیے بدلہ اور قصاص ہی میں سامان زندگی ہے) (ملاحظہ ص ۱۱۶)۔ اہم اسلامی غزوات کے مقامات پر مبنی ایک نقشہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

۹ھ کو عام الوفود بھی کہتے ہیں۔ مولانا علی میاں مشہور محدث غلام محمد طاہر پٹنی م ۹۸۶ھ کی کتاب مجمع بحار الانوار کا اقتباس نقل کرتے ہیں: ''یہ سال آمد وفود کا سال تھا''۔

عرب قبائل نے اسلام کے ساتھ قریش کے معاملہ کا انتظام کیا تھا۔ اس لیے وہی لوگ سب کے پیشوا تھے اور بیت اللہ کے ذمہ دار تھے، جب انہوں نے اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، مکہ فتح ہو گیا اور قبیلہ ثقیف نے بھی اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے محسوس کر لیا کہ اب ان کے اندر ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں، اس وقت ہر طرف سے وفود کی کثرت ہوئی اور لوگ گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے'' (ص ۱۲۰)، مولانا موصوف آگے رقمطراز ہیں کہ ''ان سب باتوں کا عربوں کے دل و دماغ پر (جو بہر حال انسان تھے) قدرتی طور پر اثر پڑا اور اس کی وجہ سے اسلام میں داخل ہونے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی حاضری کا ایک دروازہ کھل گیا اور تلاش حق میں مختلف وفود مرکز اسلام میں اس کثرت سے آنے لگے جس طرح کوئی موتی کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے سارے دانے اسلام کی آغوش میں آجائیں'' (ص ۱۲۰)۔

یہ پورا نقشہ گویا وہی تھا جسے اللہ نے سورۃ النصر میں بیان فرمایا ہے۔ اگرچہ سورۃ النصر کا نزول ایک روایت کے مطابق حجۃ الوداع میں ایام التشریق میں ہوا (ابن کثیر، تفسیر، ج ۷ ص ۳۹۴) لیکن ابن عباسؓ کی ایک روایت کے مطابق

قال: بینما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المدینۃ اذ قال ''اللہ اکبر اللہ اکبر جآء نصر اللہ و الفتح ! جآء اھل الیمن قیل یا رسول اللہ و ماھل الیمن؛

قال قوم رقيقة قلوبهم، لينة طباعهم، الايمان يمان، والفقه يمان والحكمة يمانية (ایضاً ص ۳۹۵) والمراد خصوصاً فتح مكة قولا واحداً فان أحياء العرب كانت تتقوم باسلامها فتح مكة يقولون ان ظهر على قومهفهو نبى قلما فتح الله عليه مكة دخلوافى دين الله افواجا (ایضاً ص ۳۹۸)

مولانا ابومحمد عبدالحق حقانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے'' آیت میں چار باتیں بیان فرمائی ہیں: اول اللہ کی نصر کا آنا، دوم فتح کا حاصل ہونا، سوم لوگوں کا دین الٰہی میں داخل ہونا اور چہارم ایک ایک دو دو کا نہیں، بلکہ جماعتوں اور قوموں کا دین میں داخل ہونا (تفسیر حقانی، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، طبع ششم ج ۳ ص ۲۶۰)، آگے لکھتے ہیں اور اخیر عمر میں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آرہے تھے یہ بات حاصل ہونے لگی تھی اور یوماً فیوماً ترقی پر تھی۔ خصوصاً فتح مکہ کے بعد سے روز مرہ قبائل کے قبائل اور کبھی ان کے ایلچی آتے اور تلقین پاکر جاتے اور سب مسلمان ہوجاتے تھے۔ آپؐ نے خود جماعتوں کی جماعتوں کو دین الٰہی میں داخل ہوتے دیکھ لیا اور خدائے پاک نے اپنا وعدہ پورا کردیا (ایضاً).

آگے رقمطراز ہیں''مفسرین نے نقطہ نظر اور فتح کے وسیع مضمون کو ایک ایک بات میں محدود کیا ہے، حالانکہ وہ سب کو شامل ہے اور سب ہی مراد ہیں پس جس طرح نصرت الٰہی کے متعدد طریقے معلوم ہوئے اس طرح فتح کے بھی ہیں (۱) اول فتح مکہ (ایضاً)، (۲) بعض کہتے ہیں فتح سے مراد خیبر کی فتح ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد، جبکہ مسلمانوں کے رنج وملال تھا واقع ہوئی (ایضاً ص ۲۶۱) (۳) جمیع فتوحات مراد ہیں..... فتح مکہ، خیبر، طائف، حنین وغیرہ (۴) فتوحات غیبیہ علوم و اسراء ملکوتیہ جو رفتہ رفتہ آپ پر منکشف ہوتے تھے، (ایضاً)۔

بہرحال تاریخی طور پر یہ بات طے شدہ اور واضح ہے کہ غزوات وفتوحات کا تمام تر سلسلہ مکمل ہو چکا تھا جس کے نتیجہ میں عرب کے گوشہ گوشہ سے لوگ فوج درفوج دائرہ اسلام میں داخل ہوے اور وفود پے در پے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے، یہاں تک کہ اس سال کا نام ہی عام الوفود پڑ گیا۔ کچھ وفود کی تفصیل اور تعارف مصنف نبی رحمت نے (ص ۱۱۹ تا ۱۲۷) پیش کیا ہے (مولانا قاضی سلیمان منصور پوریؒ نے وفود کے سلسلہ میں بہت تفصیل سے کام لیا ہے اور

قابل مطالعہ ہے، (رحمۃ للعالمین ج:۱)

حج اور زکوٰۃ کا ارکان اسلام میں شمار ہوتا ہے۔ دونوں ارکان کی فرضیت اسی سال یعنی ۹ ھ میں ہوئی۔ مولانا علی میاں نے لکھا ہے کہ حج ۹ ھ میں فرض کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج بنایا (نبی رحمت ص ۱۱۷)، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ سے تین سو آدمیوں کا قافلہ حج کے لیے روانہ ہوا'' (ملاحظہ ہو: ایضاً ص ۱۱۸) اس وقت سورۂ براءت کی ابتدائی آیات اور ان کے احکام نازل ہوئے جن کا اعلان و نفاذ کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکرؓ کے فوراً بعد بھیجا اور جب سب لوگ منیٰ میں جمع ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انہیں پڑھایا اور سنایا (مثلاً جنت میں کوئی کافر داخل نہیں ہو سکے گا اور یہ بھی اعلان عام ہوگیا کہ ''اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرسکتا اور کوئی شخص برہنہ ہوکر طواف نہیں کرسکتا''، (دیکھیے ص ۱۱۸) البتہ حاشیہ میں یہ لکھا کہ ''بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ حج ۶ ھ میں فرض ہوا، شیخ محمد الخضری نے اپنی کتاب ''تاریخ التشریع الاسلامی'' میں اسی قول کو اختیار کیا ہے (حاشیہ نمبر ۵ ص ۱۱۷)۔ عوام الناس کے لیے کافی خلجان کا باعث ہے۔ ۶ ھ میں حج کی فرضیت خلاف واقعہ ہے۔ آنحضورؐ نے تعمیل رویاء کے مطابق عمرۃ الحدیبیہ ۶ ھ میں اور عمرۃ القضاء ۷ ھ میں ادا فرمایا تھا، مولانا علی میاں نے زکوٰۃ کی فرضیت کے تحت لکھا ہے کہ ''ہجرت کے پانچویں سال زکوٰۃ فرض ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امراء و عمال کو ان تمام علاقوں میں جہاں اسلام پہنچ چکا تھا روانہ فرمایا'' (ص ۱۲۷)۔ اس بیان میں دونوں باتیں یعنی فرضیت زکوٰۃ اور امراء، عمال و عاملین زکوٰۃ کا تقرر درحقیقت ۹ ھ کا ہی واقعہ ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی علیہ الرحمہ نے سیرۃ النبی (جلد اول) میں ۹ ھ کے عنوان کے تحت غزوۂ تبوک (ص ۵۱۸)، مسجد ضرار (ص ۵۲۱) حج اسلام اور اعلان برأت (ص ۵۲۲) کے علاوہ واقعات متفرقہ کے تحت لکھا ہے کہ ''نو سال کے بعد اب ملک میں امن و امان کا دور شروع ہوا اب حصول دولت کے مواقع حاصل تھے، اس بنا پر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا اور تحصیل زکوٰۃ کے لیے عمال قبائل میں مقرر ہوئے، اسلام کے سائے میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہوچکی تھیں، ان کے لیے جزیہ کی یہ آیت اتری ''حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون (توبہ: ۴۰)۔ سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۰ ھ

میں حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان عام فرمایا (دیکھیے ص ۵۲۴)۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے پریشانی ہوتی ہے، حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا'' (زکوٰۃ کے سلسلہ میں مزید تحقیق و تنقیح کے لیے ملاحظہ ہو سیرت النبی ج ۵، لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۱۷۹ و مابعد)

کتاب نبی رحمت کا اگلا عنوان ''الوداع'' ہے جس میں حجۃ الوداع اور اس کے وقت کا انتخاب نیز حجۃ الوداع کی دعوتی، تبلیغی اور تربیتی اہمیت (۱۲۸) کے بعد آپ نے کیسے حج ادا فرمایا اور آپ کا عظیم الشان (خطبہ)، خطبۂ عرفہ (ص ۱۳) اور وفات نبویؐ سے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت تک (ص ۶۱۔۱۶۰) کے واقعات انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد عنوان ''ازواج مطہرات و اولاد اطہار'' دیا گیا ہے جو (ص ۱۶۳ سے ص ۱۷۳ تک) پھیلا ہوا ہے اور ضروری نکات آ گئے ہیں۔ اگلا باب اخلاق و شمائل (۱۷۴ تا ۲۱۰) کتاب کی دعوتی و تبلیغی نوعیت سے ہم آہنگ ہے۔ آخری عنوان **وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین** (۲۲۱ تا ۲۳۲) گویا کتاب کا خلاصہ اور کارنامہ ہائے نبوت کا تجزیاتی مضمون ہے اور اسی پر کتاب ''نبی رحمتؐ'' ایک خوشگوار تاثر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب نبی رحمتؐ سیرت کے موضوع پر عصری اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہے، آسان و سادہ زبان میں داستان طرازی، تصنع تکلف سے مبرا، نہ بہت طویل نہ بہت مختصر، درمیانی ضخامت کی معقول کتاب ہے، جو بنیادی طور پر علمی تربیتی اور دعوتی توعیت کی حامل ہے اور اپنے رنگ و آہنگ میں وہی دھیما، سنجیدہ، پروقار انداز رکھتی ہے جو وابستگان ندوۃ العلماء کا خاصہ ہے، جیسے شبلی کو پڑھ رہے ہیں، جیسے سلیمانی ندوی کو دیکھ رہے ہیں اور جیسے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بزم جہاں تاب میں شرکت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

## مطبوعات عالمی رابطہ ادب اسلامی، پاکستان

۱۔ مقالاتِ پروفیسر عبدالقیوم، سیمینار

۲۔ حج وعمرہ کے سفرنامے، جدید تحدیات کے تناظر میں
(بین الاقوامی سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)

۳۔ دستور اساسی، رابطہ ادب اسلامی

۴۔ ابیات سلطان باہو۔

۵۔ شعر الشیخ فرید الدین مسعود (عربی ترجمہ)

۶۔ نذر نعیم (مقالات)

۷۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کا اسلامی ادب

۸۔ دیوان حسین الاہوری (عربی ترجمہ)۔

برائے رابطہ
دفتر: واقع جامعہ اشرفیہ، لاہور
فون: 042-7533292